"بیمۂ زندگی"

ممتاز علمائے مصر کی نظر میں

(ترجمہ: مولانا فضل الرحمٰن، ایم۔اے۔بی۔ٹی۔ایچ (علیگ)، ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

"لواء الاسلام" قاہرہ کا ایک دینی، ثقافتی اور اجتماعی ماہنامہ ہے جو ۱۲ سال سے شائع ہو رہا ہے، اس ماہنامہ میں مصر کے بہترین علماء کے مقالے شائع ہوتے ہیں۔ ماہنامہ کی طرف سے ایک مجلس مذاکرہ، اہم اسلامی مباحث پر گفتگو کرنے کے لیے ہر ماہ منعقد کی جاتی ہے جس میں مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے علماء بحث میں آزادانہ حصہ لیتے ہیں، اس تمام بحث کو ہر ماہ، ندوۃ لواء الاسلام، کے مستقل عنوان کے تحت ماہنامہ میں شائع کر دیا جاتا ہے۔

زیر نظر مباحثہ جو لواء الاسلام جلد ۸ نمبر ۱۱ بابت رجب ۱۳۷۴ھ/مارچ ۱۹۵۵ء سے ترجمہ کیا گیا ہے اور رسالہ کے صفحہ ۷۰۸ سے ۷۲۰ تک پھیلا ہوا ہے، بیمہ زندگی کے اہم موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ ترجمہ کی پیشکش کا بڑا مقصد، برصغیر ہند و پاک کے ماہرین شریعت اسلامیہ کے لیے فکر انگیزی کا سامان اور دوسرے حضرات کے لیے معلومات فراہم کرنا ہے کیونکہ بیمہ کا موضوع دوسرے بہت سے جدید مسائل کے مانند دینی نقطۂ نظر سے فنی انداز پر تشریح کے لحاظ سے ابھی تک بے حد تشنہ ہے، اگر برصغیر کے صاحبانِ علم بھی موجودہ سیاسی و معاشی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں شریعت اسلامیہ کا موقف واضح کرنے کی کوشش فرمائیں تو شاید بہت سے لوگوں کے لیے رہنمائی کا باعث بن سکیں گے۔[1] مزید یہ کہ

[1] اس سلسلے کی ایک کوشش نعیم صدیقی صاحب کا مقالہ بعنوان "بیمۂ زندگی یا لائف انشورنس (اسلامی نقطۂ نظر سے)" ہے جو ترجمان القرآن لاہور مرتبہ سید ابوالاعلیٰ مودودی، جلد ۵۰ عدد ۴ بابت ماہ شوال ۱۳۷۷ھ/ماہ جولائی ۱۹۵۸ء

اگر ندوۃ لواء الاسلام کی طرح، ماہانہ مباحثوں کے منعقد کرنے اور ان کو شائع کرنے کا اقدام ہند و پاک کے کسی مجلّہ کی طرف سے ہو سکے تو یہ نہ صرف عامۂ مسلمین بلکہ دیگر اہلِ علم و فضل حضرات کے لیے جدید مسائل کے انہام و تفہیم کے نقطۂ نظر سے ایک مفید سلسلہ ثابت ہو سکے گا۔ (مترجم)

۸ر جمادی الاخر ۲، ۱۳۷۴ھ مطابق یکم فروری ۱۹۵۵ء بروز منگل بوقت شام ندوۃ لواء الاسلام، کا اجلاس منعقد ہوا جس میں حسبِ ذیل حضرات نے حصہ لیا۔

احمد حمزہ، الحاج امین الحسینی مفتی فلسطین، محمد المفتی الجزائری، عبدالعزیز علی، خطاب محمد، امین عز العرب، منصور رجب، صبری عابدین، محمد علی الحومانی، حنفی احمد، سلیمان النقاد، مصطفیٰ ربیع، یوسف الحدیدی، محمود سلیمان، مصطفیٰ زید، عبدالفتاح شلبی، محمد سابق۔

نیز اساتذہ، عبدالوہاب خلاف، محمد البنا، محمد ابوزہرہ، عبدالوہاب حمودہ، عبدالحلیم بسیونی، محمد توفیق عریہ، محمد کامل البنا، محمد علی شتا۔

موضوعِ بحث "بیمہ زندگی" تھا۔

بحث کا آغاز محمد کامل البنا نے کیا، آپ نے فرمایا:

ان کمپنیوں کے بارے میں مجلس کی کیا رائے ہے جو لوگوں کے ساتھ اس شرط پر معاہدہ کرتی ہیں کہ وہ ایک معینہ رقم، ایک معینہ مقررہ مدت تک، ان کمپنیوں کو ادا کرتے رہیں گے جس کے عوض میں اُن لوگوں کی زندگی بیمہ شدہ سمجھی جاتے گی، بایں معنی کہ اگر وہ بیمہ شدہ شخص، اس مقررہ مدت تک بقیدِ حیات رہتا ہے تو وہ کمپنی اس کو، ورنہ اس کے انتقال ہو جانے کی صورت میں، اس شخص کو جسے وہ بیمہ دار بحالتِ مرگ نامزد کر دے ایک مقررہ

۴۔ صفحہ ۲۲ - صفحہ ۴۵، میں شائع ہوا ہے۔ موصوف نے مسئلہ زیرِ بحث کا جائزہ، معاشی و اسلامی نقطۂ نگاہ سے لینے کی کوشش کی ہے۔ نیز دیکھیے۔ امداد الفتاویٰ از مولانا اشرف علی تھانوی جلد سوم، صفحہ ۴۲، ۴۳ تا ۴۹ و فتاویٰ دار العلوم دیوبند جلد اول و دوم، امداد المفتیین باب الربوٰ والقمار ص۱۵۱ (مترجم)

رقم ادا کرے گی۔ یہ ادائیگی یک مشت بھی ہو سکتی ہے اور بالاقساط بھی۔ زندگی کے علاوہ یہ کمپنیاں حوادث مثلاً قتل، آتشزدگی ایکسیڈنٹ، وغیرہ کے لیے بھی بیمہ کرتی ہیں۔

استاذ حنفی احمد: سوال کی مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ بیمہ کار کمپنیاں عموماً بیمہ داروں یا بیمہ داری کے خواہشمند حضرات کو ایک معینہ فی صد سالانہ رقم بطور منافع، ان اقساط کے عوض میں جو وہ کمپنی کو ادا کر رہا ہے، پیش کرتی ہیں۔ اس صورت میں اقساط کی مجموعی مقدار مقررشدہ مدت کے اندر اتنی ہو جاتی ہے جتنی اس کمپنی کو بیمہ دار کی موت یا مقرر شدہ مدت کے اختتام کے بعد اس شخص کے نامزد کردہ یا اس شخص کو ادا کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر بیمہ دار اس بات سے انکار کرتا ہے کہ ادا کردہ اقساط کی مالیت پر سالانہ منافع لے تو اس صورت میں اُن اقساط کی مجموعی مالیت جو اس کے ذمہ واجب الادا ہیں۔ زرِ بیمہ سے کم رہتی ہے، بالفاظ دیگر یہ منافع اس بات کا معاوضہ ہوتا ہے کہ کمپنی اُن سالانہ اقساط پر بیک وقت تصرف کرنے کی مجاز ہو۔

استاذ امین عز العرب: اسی طرح بیمہ دار کو ایک مقررہ مدت گزرنے کے بعد یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ بیمہ کمپنی سے، بنکوں کے مقابلہ میں، کم مقدارِ منافع پر قرض لے سکے۔

استاذ عبدالوہاب حمودہ: پیش کردہ صورتِ حال گویا اس بات کو متقاضی ہے کہ بیمہ دار، ادا کردہ رقم سے زیادہ پر قبضہ کرنے کا حقدار ہو جاتا ہے۔

استاذ سلیمان العقاد: بیمہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بیمہ دار، مدتِ بیمہ کے اختتام تک اقساط ادا کرتا رہے اور زرِ بیمہ کی کل مقدار اتنی ہی ہو جتنی بغیر منافع کے مجموعی اقساط کی مقدار ہوتی ہے۔ اس بیمہ سے استفادہ صرف حالتِ مرگ میں ہو سکتا ہے۔

استاذ عبدالعزیز علی: بعض کمپنیاں زندگی کے بیمہ دار کو اس کی ادا کردہ رقم پر ایک مقررہ منافع دینے کے بجائے اپنے عمومی منافع کے تناسب سے منافع ادا کرتی ہیں۔

الحاج یوسف الحدیدی: بعض کمپنیوں کا طریقہ یہ ہے کہ بیمہ دار کے انتقال کے

بعد اس کے نامزد کردہ شخص کو پورا زرِ بیمہ یک مشت ادا کرنے کے بجائے، ایک طویل مقررہ مدت تک اس کو ماہانہ رقم ادا کرتی رہتی ہیں۔

استاذ عبدالوہاب خلّاف: بیمۂ زندگی (التأمین علی الحیاۃ) کے نام سے مروّجہ نظامِ کار کے متعلق اپنی معلومات کے پیشِ نظر میرا خیال یہ ہے کہ

(۱) یہ نظامِ کار نہ تو زندگی کی کوئی ضمانت دیتا ہے اور نہ اس کا مقصود جان کی حفاظت، عمر میں اضافہ یا تقدیر کی مخالفت یا مقابلہ ہے۔ اس کی غرض و غایت صرف آدمی کے آمدنی کے ایک حصّہ کو محفوظ کرنا اور اسے جمع رکھنا ہے تاکہ اس سے آہستہ آہستہ ایک ایسی رقم بن جائے جس سے قسط گزار، اگر اس کی زندگی اُن اقساط کی ادائیگی کی تکمیل تک وفا کرے، خود منتفع ہو سکے اور اگر اس کا پیمانۂ حیات، ادائیگی کی تکمیل سے قبل ہی لبریز ہو جاتا ہے تو کوئی دوسرا نامزد کردہ شخص اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ چنانچہ یہ صرف سرمایہ جمع کرنے کا ایک اختیاری معاملہ ہے جس کا منتہائے مقصود اتنا ہی ہے کہ آدمی اپنی آمدنی اور مال کا کوئی حصّہ پس انداز کر سکے تاکہ وہ سن رسیدگی کے وقت خود اس کے یا اس کی ناگہانی موت کی صورت میں اس کے وارثین یا اس کے مختار کار کے کام آسکے۔ اس نظامِ کار کو "تامین علی الحیاۃ" کے نام سے موسوم کرنا ہی سرے سے غلط ہے کیونکہ یہ تو محض پس اندازی و اندوختگی اور قسط گزار اور اس کے ورثاء کے لیے زندگی کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا نظامِ کار ہے۔ جو لوگ اس پر یہ اعتراضات کرتے ہیں کہ موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، تقدیر سے مفر نہیں اور تقدیر کے آگے تدبیر کی نہیں چلتی وہ اس کے غلط نام سے دھوکا کھا کر، اس کی حقیقت پر اعتراض کرتے ہیں۔

(۲) یہ نظامِ کار عقودِ جدیدہ میں سے ہے۔ قرآن و سنت میں اس کے بارے میں کوئی نصِ صریح قطعی موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق شرعی حکم معلوم کرنے کا ذریعہ صرف اجتہاد رہ جاتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ شریعت کے عمومی قواعد کو اس نظام پر منطبق کر کے دیکھا جاتے اور اس کو ایسی نظیر پر قیاس کیا جاتے جس کے حکم کے بارے میں نص وارد

ہوئی ہو یا اس سے حاصل ہونے والے مصالح اور اس کے ذریعے دفع ہونے والے مفاسد کا جائزہ لیا جائے یا ان طریقوں کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ استعمال کیا جائے جو شریعت نے ایسے معاملات میں اجتہاد کرنے کے لیے مشروع کیے ہیں جن کے بارے میں کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو۔ ایسے تمام معاملات کے بارے میں جو بیک وقت مدنی اور دینوی دونوں نوعیتوں کے حامل ہیں اور اور جن کے بارے میں شریعت میں کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو، اجتہاد کا اساسی اصول یہ ہونا چاہیے کہ ایسے سارے معاملات مباح ہیں جو لوگوں کے لیے نفع محض کا سبب بنتے ہوں یا ان میں نفع و ضرر دونوں پائے جاتے ہوں لیکن ان کا نفع ان کے ضرر سے زیادہ ہو، کیونکہ تشریع احکام سے شریعت کا مقصد، انسانوں کے لیے حصولِ مصالح اور دفعِ ضرر کے سوا کچھ نہیں، برخلاف[1] اس کے جن معاملات کی نوعیت یہ ہو کہ ان پر ضرر محض مترتب ہوتا ہو یا ضرر و نفع دونوں مترتب ہوں لیکن ضرر ان کے نفع سے کہیں زیادہ ہو تو وہ ناجائز ہیں۔ اس اصول کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

[1] انحطاط کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ وہ جب کسی قوم پر چھا جاتا ہے تو اس کے اندر بے اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم زندگی کے ہر معاملے کو اس کے دینی فائدے اور اخروی اجر کے نقطۂ نظر سے دیکھیں لیکن اس دورِ زوال میں اب ہم ہر معاملہ کو جیب اور پیٹ کے معیار سے ماپنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ تشریع احکام سے شریعت کا مقصد انسانوں کے حصولِ مصالح اور دفعِ ضرر ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ ذہن نشین رہے کہ حصولِ مصالح سے مغرب کی "افادیت پرستی" کے لیے جواز تلاش کرنا صحیح اور درست نہیں۔ اس اصول (حصولِ مصالح اور دفعِ ضرر) کی اگر کوئی اہمیت ہے تو اس دائرہ میں ہے جس دائرہ میں سارا مدارِ بحث قیاس یا عرف و مصلحت پر ہو۔ باقی رہے وہ امور جو کتاب و سنت یا اجماع سے ثابت ہیں تو وہاں اس اصول کو کسی طرح رہنما نہیں بنایا جا سکتا۔ بیمہ میں قمار اور سود دونوں کے عناصر شامل ہیں اس لیے اس معاملہ کو استحسان یا مصلحت مرسلہ کے دائرہ میں لانا صریح زیادتی ہے۔ اگر شریعت کا منشا یہ سمجھ لیا جائے کہ محض مصلحت اور مفاد کو سامنے رکھ کر جس چیز کو انسان چاہے حلال قرار دے دے اور جس چیز کو چاہے حرام ٹھہراتا چلا جائے تو یہ شریعت کی پیروی نہیں بلکہ اس سے بغاوت ہے

(ع - ح - ص)

فرمان "لا ضرر ولا ضرار"[1] ہے۔

(۳) بیمہ کاری کا نظام، دوسرے شرعی عقود کے مقابلہ میں، عقدِ مضاربت (جسے اکثر فقہا قراض بھی کہتے ہیں) سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے، اسی کے تحت رکھے جانے کے لائق ہے۔ کیونکہ شریعتِ اسلامیہ میں مضاربت، منافع میں شرکت کے ایک ایسے عقد کو کہتے ہیں جس میں ایک جانب سے سرمایہ ہوتا ہے اور دوسری جانب سے محنت۔ صورتِ زیرِ بحث (بیمہ زندگی) میں سرمایہ ان قسط گزاروں کی جانب سے ہوتا ہے جو اقساط کی ادائیگی کرتے ہیں اور محنت اس کمپنی کی طرف سے ہوتی ہے جو اس سرمایہ کو کھپاتی ہے اور منافع، کمپنی اور قسط گذاروں میں آپس کے معاہدہ کی رو سے تقسیم ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر دو اعتراض کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ مضاربت کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ سرمایہ کار اور محنت کار کے درمیان منافع نسبت کی بنیاد پر طے ہو اور دونوں میں سے کسی فریق کے لیے منافع کی کوئی معین مقدار مشروط نہ ہو لیکن بیمہ کے معاملہ میں قسط گذار کو فی صد کے حساب سے منافع کی ایک معین مقدار ملتی ہے جس کی وجہ سے مضاربت صحیح نہیں رہتی۔

۲۔ کمپنی جو اس سرمایہ کو کھپاتی ہے وہ اس بات کی پابند نہیں ہوتی کہ اس سرمایہ کو شریعت کے مباح کردہ مواقع میں یا جائز طریقوں سے ہی استعمال کرے کیونکہ وہ جہاں اس سے تجارت کرتی ہے یا عمارات بناتی ہے اور بہت سے دوسرے جائز کام کرتی ہے وہاں وہ منافع پر قرض بھی دیتی ہے جو سودی کاروبار ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب الاستاذ الامام محمد عبدہٗ کی سورۂ بقرہ کی آیاتِ ربا کی وہ تفسیر ہے جس کی عبارت یہ ہے[2] "لا یدخل فی الربا المحرم بالنص الذی لا شک فی تحریمہ من یعطی

---

[1] اس حدیث کو ابن ماجہ اور دارقطنی وغیرہ نے بطور مسند اور امام مالکؒ نے موطا میں بطور مرسل روایت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو سنن ابن ماجہ احکام ۱۷، موطا اقضیۃ ۳۱، مسند احمد بن حنبل ۵/۳۲۷ تحقیق احمد محمد شاکر۔ مستدرک حاکم، وبیہقی و دارقطنی من حدیث ابی سعید الخدری۔ نیز الاشباہ والنظائر لابن نجیم مع شرح الحموی القاعدۃ الخامسۃ الضرر یزال۔ (مترجم)

[2] تفسیر المنار تالیف سید رشید رضا ۳/۱۱۶ طبعۃ ثانیۃ۔ (مترجم)

آخر مالاً یستغلہ ویجعل لہ من کسبہ حظاً معیناً، لان مخالفۃ اقوال الفقہاء فی اشتراط ان یکون الربح نسبیاً لاقتضاء المصلحۃ ذلک لاشیئ فیہا، وھذہ المعاملۃ نافعۃ للعامل ورب المال معاً، اما الربا المحرم ففیہ اضرار بواحد بلا ذنب غیر الاضطرار، ونفع لواحد بلاعمل، ولایمکن ان یکون حکمھما فی عدل اللہ واحدا ولایمکن ان یقول عاقل عادل ان النافع یساوی الضار فی حکمۃ۔ (اس سود کے تحت جس کی حرمت منصوص اور شک وشبہ سے بالاتر ہے، یہ چیز داخل نہیں کہ ایک شخص کسی دوسرے کو پیداواری اغراض کے لیے سرمایہ دے اور اس شخص کی کمائی میں سے اپنے لیے ایک معیّنہ مقدار مقرر کرے کیونکہ فقہاء کے ان اقوال کی مخالفت جن میں انھوں نے بربنائے مصلحت مضاربت میں منافع کا ازروئے نسبت طے ہونا شرط قرار دیا ہے کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ وجہ یہ کہ اس معاملہ میں سرمایہ کار اور محنت کار دونوں ہی کا فائدہ ہوتا ہے برخلاف حرام کردہ ربا کے کہ اس میں ایک فریق کو محض تنگدستی اور مجبوری کے جرم کی بنا پر ضرر پہنچتا ہے اور دوسرے کو بلا کسی محنت کے فائدہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ ان دونوں صورتوں کا حکم اللہ کے انصاف کے سامنے یکساں ہو اور نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی عقل مند اور منصف مزاج یہ کہدے کہ نفع مند اور نقصان دہ چیزوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہیے)۔

مزید برآں یہ مسئلہ کہ منافع مقررشدہ مقدار کی صورت میں طے نہ ہو بلکہ ازروئے نسبت طے کیا جائے، اجماعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس میں بعض فقہاء نے اختلاف کیا ہے[1]

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ منافع پر قرضہ لینے کی حرمت، سدِّ ذریعہ[2] کی قبیل سے ہے اور یہ امر علماء کے نزدیک ثابت شدہ ہے کہ جو چیز سدِ ذریعہ کے طور پر حرام قرار دی جاتے

۱؎ استاذ خلاف کی یہ رائے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں مختلف فیہ ہے، میرے نزدیک صحیح نہیں، مذاہب اربعہ کی معتبر کتب سے اس میں کسی اختلاف کا حال نہیں معلوم ہوتا (مترجم)

۲؎ سد ذریعہ کی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: ارشاد الفحول للشوکانی ص۲۱۶ طبعہ صبیح، الفروق للقرافی جلد ۲ ص۳۹ تا ۴۱ طبعہ تونسیہ ۱۳۰۲ھ، اعلام الموقعین لابن القیم جلد ۱ ص۲۰۳، التوسل والوسیلہ لابن تیمیہ، طبعہ المنار ص۱۶

وہ حاجت کے وقت جائز ہو جاتی ہے۔ فقہاء کا قول ہے کہ حاجات بعض محظورات کو جائز کر دیتی ہیں۔ فقہاء حنفیہ میں سے صاحب الاشباہ والنظائر کا قول ہے "ومن ذالك الافتاء بصحة بيع الوفاء[1] حين كثر الدين على اهل بخارى، وهكذا المصر، وسموه بيع الامانه وتجويز الاستقراض بالربح للمحتاج (بیع الوفا کی صحت کا فتویٰ جب کہ اہل بخاریٰ پر قرض بہت زیادہ ہو گیا تھا، اسی قبیل سے ہے جیسا کہ مصر میں بھی ہوا کہ اس کا نام بیع الامانۃ رکھا گیا اور محتاج کو منافع پر قرض لینے کا جواز اسی قبیل سے ہے۔)

میری رائے یہ ہے کہ یہ نظامِ کار جس کا نام بیمۂ زندگی ہے، عقدِ مضاربت ہے اور عقد صحیح ہے جو چندہ گذاروں اور کمپنی دونوں کے لیے نفع بخش ہے اور ساتھ ہی ساتھ معاشرہ کے لیے بھی اس میں نہ تو اضرار (نقصان پہنچانا، ضرر رسانی) لازم آتا ہے اور نہ بغیر حق کے کسی کا مال کھا جانا۔ اور یہ درحقیقت اندوختگی، تعاون اور پس اندازی ہے تاکہ سن رسیدگی کے وقت چندہ گذار کے کام آئے اور اس کی مرگِ ناگہانی کی صورت میں، اس کے ورثاء کی صلاحِ کار کا سبب بنے۔ شریعت صرف نقصان دہ چیز کو حرام کرتی ہے یا اس چیز کو جس کا نقصان اس کے فائدہ سے زیادہ ہو، مختصر یہ کہ یہ ایک جائز تصرف ہے۔ اگر میری یہ رائے صحیح ہے تو محض توفیقِ ایزدی ہے ورنہ بصورتِ دیگر عقل کی لغزش۔

استاذ محمد البنا: بیمہ کمپنیوں کے بارے میں مجلس کے سامنے جو سوال رکھا گیا ہے، اس سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے۔

(۱) یہ معاملہ ان عقود میں سے نہیں جو شریعتِ اسلامیہ کے واسطے سے ہمارے

---

[1] بیع الوفاء کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الجزء الاول من الفتاوی البزازیۃ طبع علی ہامش الفتاوی الہندیۃ، نوع فیما یتصل بالبیع الفاسد ص ۴۰۵ تا ص ۴۲۳ المطبعۃ الامیریۃ ۱۳۱۰ھ۔ بیع الوفا کو بیع الامانۃ (زیلعی) اور الرہن المعاد (الملتقط) بھی کہتے ہیں۔ بیع الوفا کا ذکر تین مواضع میں آتا ہے مثلاً البزازی نے البیع الفاسد میں، قاضی خاں نے خیار العقد میں، اور زیلعی نے الاکراہ میں ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں بزازی نے آٹھ اقوال نقل کیے ہیں۔ (مترجم)

پاس پہنچے ہیں بلکہ ایک بالکل جدید عقد ہے جس کی نظیر اس سے قبل نہیں پائی جاتی۔ ایسے جدید عقود کے متعلق شرعی حکم معلوم کرنے کا ذریعہ اجتہاد کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جس کا طریقہ کار یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو اس کو کسی شرعی عقد سے ملحق کیا جاتے اور اگر غور و فکر کے بعد یہ معلوم ہو کہ وہ کسی عقد سے موافقت یا مشابہت رکھتا ہے اور کوئی ایسا جوہری اور بنیادی فرق، ان دونوں کے درمیان نہیں پایا جاتا جو حکم پر اثر انداز ہو سکے تو اس کی اباحت کا حکم دے دیا جائے ورنہ عدم اباحت کا۔

(۲) شریعت اسلامیہ میں پائے جانے والے عقود کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بیمہ کا عقد، کسی ایسے عقد سے نہ ایسی مشابہت رکھتا ہے اور نہ موافقت کہ جس سے اُن دونوں پر ایک ہی حکم کے اجراء کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اگرچہ یہ بات دیکھ کر کہ عقدِ مضاربت میں ایک جانب سے سرمایہ ہوتا ہے اور دوسری جانب سے محنت اور ایسا ہی بیمہ میں ہوتا ہے بعض حضرات نے بیمہ کو مضاربت سے ملحق کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم میں اس رائے کے خلاف ہوں کیونکہ بیمہ اور مضاربت میں کئی جوہری فرق موجود ہیں۔ مضاربت کی شرط یہ ہے کہ منافع معین نہ کیا جائے بلکہ از روئے نسبت طے کیا جائے، یہ ایسا اساسی فرق ہے کہ اس سے کسی قیمت پر اعراض ممکن نہیں اور نہ اس شرط کے بغیر ایک کا قیاس دوسرے پر ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں الاستاذ الامام محمد عبدہٗ سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے منافع کی مقدار کے معین ہونے کو جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ فقہاء کے وہ اقوال جن میں منافع کو از روئے نسبت طے ہونا مضاربت کی شرط بتایا گیا ہے بر بنائے مصلحت ہیں اور ان اقوال کی مخالفت کوئی ایسی بات نہیں ہے تو یہ استاذ الامام کا ذاتی اجتہاد ہے اور جیسا کہ قائل کو خود اقرار ہے اقوالِ فقہاء کے قطعی خلاف ہے تو عرض یہ ہے کہ استاذ امام کی مخالفت، بہ نسبت مختلف ادوار کے فقہاء کی ایک کثیر تعداد کی مخالفت کے، آسان ہے۔ لیکن اگر استاذ الامام کے اس قول کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی بات جہاں تھی وہیں رہتی ہے اور بیمہ اور مضاربت کے درمیان

مشابہت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی، کیونکہ جو شخص منافع کے متعین کرنے کے جواز کا قائل ہو گیا، اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ خسارہ کی تعیین کے وجوب کا بھی قائل ہو کیونکہ یہ تو کسی حالت میں ممکن نہیں کہ کوئی اس بات کا قائل ہو کہ سرمایہ کار کو ہمیشہ فائدہ ہی ہونا چاہیے حالانکہ بیمہ میں بیمہ دار پر اس نقصان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی ہے جو کمپنی کو لاحق ہو اور یہ وہ چیز ہے جو بیمہ اور مضاربت میں شدید قسم کا فرق کر دیتی ہے۔

(۳) بیمہ کو مضاربت سے ملحق کرنے والے حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس پر صرف دو اعتراض وارد ہوتے ہیں، ایک منافع کا معین ہونا جس کا جواب شیخ محمد عبدہ کی تفسیر کے ذریعہ دیا گیا ہے اور دوسرا یہ کہ جو کمپنی ان اموال میں تصرف کرتی ہے۔ اس کے لیے لازمی نہیں کہ وہ اسے شریعت کے جائز کردہ مواقع پر اور مباح طریقوں سے استعمال کرے کیونکہ جہاں وہ تجارت، بناء عمارات اور بہت سے جائز کام کرتی ہے، وہیں وہ منافع پر قرض بھی دیتی ہے جو تعامل بالربا ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا کہ منافع کی شرط پر قرض لینا، سدِ ذریعہ کے طور پر حرام کیا گیا ہے اور علماء کے نزدیک طے شدہ امر ہے کہ سدِ ذریعہ کے طور پر جو چیز حرام کی جاتی ہے وہ حاجت کے وقت جائز ہو جاتی ہے کیونکہ حاجات بعض محظورات کو جائز کر دیتی ہیں، اس سلسلہ میں بعض نصوص کو بھی اس موقف کی تائید میں سمجھ کر پیش کیا گیا۔ میری رائے میں ان نصوص کو تسلیم کرنے کے بعد بھی ان کی تطبیق مسئلہ زیرِ بحث پر مشکوک ہے کیونکہ اس رائے کے حاملین نے بیمہ اور مضاربت کے درمیان کے اس جوہری فرق کو نظر انداز کر دیا ہے جس کی بنا پر ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ وہ فرق یہ ہے کہ مضاربت میں اگر نقصان ہو تو وہ نقصان سرمایہ کار کو برداشت کرنا پڑتا ہے برخلاف اس کے بیمہ میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ پھر یہ کہ مضاربت میں اگر سرمایہ کار کا انتقال ہو جائے تو وارثین کو صرف اتنا ہی سرمایہ مل سکتا ہے جو ان کے مورث نے محنت کار کے سپرد کیا ہے برخلاف اس کے بیمہ میں اگر بیمہ دار کا انتقال ہو جائے تو اس کی موت کے بعد جس شخص کو

زرِ بیمہ ملنے والا ہے، ایک بڑی رقم، یعنی زرِ بیمہ کا حقدار قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ایسا مخاطرہ ہے جس سے شارع علیہ السلام نے روکا ہے کیونکہ سوائے اتفاقات کے اس کا کوئی اصول اور ضابطہ نہیں، کیونکہ بعض اشخاص تو ایسے نکلیں گے جنہوں نے آج بیمہ کرایا اور کل ان کے کسی وارث نے اس خطیر رقم پر قبضہ کر لیا اور بعض ایسے اشخاص ہوں گے جو بیمہ کرانے کے ایک طویل مدت بعد اس رقم پر قبضہ کرنے کے حقدار ہوں گے۔ اس صورت کے متعلق یقینی طور سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی شرعی عقد میں وارد نہیں ہوئی۔ ان فروق کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس کرنا قیاس باطل ہے اور کوئی شخص اس عقد کے جواز کا قائل ہے تو اسے شریعتِ اسلامیہ کے کسی دوسرے عقد کے ساتھ اس کی مشابہت تلاش کرنا چاہیے لیکن میرا ذاتی خیال اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ایسے عقدِ شرعی کا جو بیمہ سے مشابہت رکھتا ہو، ملنا محال ہے۔

(۴) خلاصۂ بحث یہ ہے کہ میری رائے میں بیمہ کا معاملہ شرعاً ناجائز ہے پھر یہ کہ ایسا معاملہ جس میں علماء کی آراء اس حد تک مختلف ہوں، اس کے بارے میں زیادہ محتاط طرزِ عمل یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "دع ما یریبك الی ما لا یریبك"[1] کے پیشِ نظر اس سے اجتناب کیا جائے۔ بہرحال میری یہ رائے اگر شارع کے مقصود کے موافق ہے تو عنایتِ ایزدی ہے اور اگر میں نادانستہ شریعت کی عطا کردہ وسعت کو تنگ کر رہا ہوں تو یہ میرا قصور ہے۔ مجھے اس رائے پر آمادہ کرنے والی چیز محض مشتبہات سے پرہیز کرنے کا جذبہ ہے کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جو مشتبہات سے پرہیز کرتا ہے وہ اپنے دین و آبرو کو صحیح و سلامت بچا لے جاتا ہے۔

استاذ صبری عابدین: میں استاذ البنا کی تائید کرتا ہوں کہ بیمہ کو مضاربت سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے یہ میسر اور قمار سے زیادہ مشابہ ہے۔ کیوں؟ اسے یوں سمجھیے کہ ایک شخص پہلی قسط، دس پونڈ کی ادا کرنے کے بعد، اگلے دن اس عالم فانی سے

---

[1] بخاری بیوع ۳، ترمذی، قیامۃ ۶۰، مسند احمد ۳/۱۵۲ (مترجم)

سدھار جاتا ہے اور اس کی اولاد ایک ہزار پونڈ کمپنی سے وصول کر لیتی ہے۔ یہ آخر کس حق کے ذریعہ ہے اور اس دستور اور قمار میں کون سا فرق ہے۔ سوالات کے متعلق استاذ حنفی احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ کمپنی بیمہ دار کو معینہ منافع بھی دیتی ہے، یہ منافع ربا ہے اور ربوی معاملات بالاتفاق ممنوع ہیں۔ لہٰذا میری رائے میں اس میں نہ صرف ربا کا شبہ ہے بلکہ صریح ربا ہے۔ ایسی چیز کو جائز قرار دینا جس کے بارے میں کوئی نصِ شرعی موجود نہ ہو، کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ بیمہ کمپنیوں کے کاروبار کی تمام تفاصیل معلوم کرنے سے پہلے، یعجلت تمام اس کے جواز کا فیصلہ کر دیا جائے۔ ہم لوگوں کو ان تمام کارروائیوں کا پورا علم نہیں جو یہ کمپنیاں عمل میں لاتی ہیں۔ ہمیں کمپنیوں کی شرائط میں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جن میں ربا موجود ہے۔ نہ معلوم، استاذ خلاف کا ردِ عمل یہ معلوم کر کے کہ ان شرائط میں صریح ربا موجود ہے کیا ہوگا پھر یہ سیدھی بات ہے کہ شرائط کا وضع کرنا اور عوام پر اُن کا نافذ کرنا کمپنیوں کا حصہ ہوتا ہے لہٰذا شریعت کے اس حق کی حفاظت کے پیشِ نظر جو ہمارے پاس امانت ہے، ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ فتویٰ دینے میں ہم کو انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے اور جب کہ یہ بات ہماری استطاعت سے باہر نہیں کہ کمپنیوں کی شرائط کو سامنے رکھ کر بے لاگ فتویٰ صادر کریں تو ایسا ہی کرنا بھی چاہیے۔

استاذ عبدالوہاب حمودہ: میری رائے یہ ہے کہ اگر کچھ ایسی بیمہ کمپنیاں ہوں جو نفع اور قرضے نہ دیتی ہوں اور نہ اپنے راس المال میں ایسے منافعوں کے ذریعے اضافہ کرتی ہوں جو شریعت کی نظر میں ناجائز ہیں تو اس طرح کی بیمہ کمپنیوں کے ساتھ معاملہ کرنا درست ہے اور فقہاء نے جو منافع کو نسبت کی بنیاد پر تقسیم کرنے کی شرط لگائی ہے، اس سے محمد عبدہٗ کی رائے کے موافق صرفِ نظر کی جا سکتی ہے۔

استاذ منصور رجب: بیمہ ان جدید معاملات میں سے ہے جو زمانہ کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور جن کے بارے میں کوئی نصِ قطعی وارد نہیں ہوئی ہے۔ اصولِ فقہ کا یہ

متفق علیہ مسئلہ ہے کہ جس مسئلہ میں نصِ قطعی موجود نہ ہو، اس میں اجتہاد واجب ہے، معاملہ زیرِ بحث میں اجتہاد دنیاوی مصلحت کی طرف راجع ہو رہا ہے جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے "انتم اعلم بامور دنیاکم"[1] لہٰذا ایسے عقود کی اباحت سے کوئی شے مانع نہیں ہو سکتی اگر ان میں کوئی یقینی مصلحت پائی جاتی ہو بالخصوص جب اس امر کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے کہ وہ خطرات جنھوں نے آج مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور انھیں شدید ضرر میں مبتلا کر دیا ہے، امتِ مسلمہ کی مادی قوت کے وسائل سے اعراض کرنے کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں اور یہ یقینی بات ہے کہ بیمہ مغربی اقوام کے نزدیک مادی قوت کا ایک اہم وسیلہ ہے۔

الشیخ عبدالعلیم بسیونی، استاذ خلاف نے شیخ محمد عبدہٗ سے نقل کیا کہ مضاربت میں منافع کی عدمِ تحدید کی شرط فقہاء کا ذاتی اجتہاد ہے ورنہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں اس کی کوئی اصل نہیں ملتی اور اسی وجہ سے انہوں نے فقہاء کے برخلاف اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ مضاربت میں نفع کو معین کر سکتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ شرط خود مضاربت کی طبیعت سے ماخوذ ہے کیونکہ مضاربت ایک تجارتی شرکت ہے اور تجارت میں بالطبع کمائی، خسارہ اور منافع غیر محدود و غیر معین ہوتے ہیں، لہٰذا فقہاء نے منافع کی عدم تعین کو شرط ٹھہرا کر، درحقیقت مضاربت کی طبیعت کو واضح و متاکد کر دیا ہے۔ مضاربت و بیمہ کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مضاربت ایسی تجارتی شرکت ہے جس کی طبیعت میں کمائی، خسارہ اور غیر معین منافع ہے برخلاف اس کے بیمہ میں، خسارہ کا سوال ہی نہیں اٹھتا، اس میں صرف منافع ہے اور منافع بھی مقررشدہ، اس لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ بیمہ اور مضاربت کو ان کی طبیعت کے تضاد اور شرط کی مخالفت کے باوجود شے واحد قرار دیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہرگز قابلِ قبول نہیں کہ مجتہدین کی رائے کو ترک کر دیا جائے اور شیخ محمد عبدہٗ کی رائے اختیار کر لی جائے۔

---

[1] ابن ماجہ، رہون باب تلقیح النخل ۱۵، مسند احمد ۶/۱۲۳، مسلم فضائل ۱۴۰ (مترجم)

استاذ کامل البنا: میرے نزدیک بیمہ ناجائز ہے اور حرام اور رباہی کی ایک قسم ہے۔

استاذ سلیمان العقاد: بیمہ کی شرکت کا حکم معلوم کرنے کے لیے مضاربت اور مخاطرت کے فرق باہمی کو، اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے، اس کے بعد اگر بیمہ مضاربت قرار پائے تو جائز ہے اور اگر مخاطرت ثابت ہو تو ناجائز۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بیمہ کی شرکت کا معاملہ مخاطرت سے قطعاً علیحدہ ہے۔ بیمہ دار کا معاملہ تو واضح ہے۔ کمپنی کے بارے میں صورت یہ ہے کہ کمپنی بیمہ کے ذریعے جمع کردہ اموال کو نفع آور کاموں میں لگاتی ہے، پھر حاصل شدہ منافع کے ایک حصہ کا ان اموال میں اضافہ کرتی ہے تاکہ اس طرح وہ رقم وجود میں آسکے جو اسے بیمہ داروں کو ادا کرنا ہے۔ یہ بات ناقابلِ تسلیم ہے کہ بیمہ دار بلا عوض کے رقم حاصل کرتا ہے کیونکہ بیمہ کی شرکت کے بارے میں جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس کے شرکت دار اپنے اموال کے ذریعے ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں، اس طرح کہ بعض شرکت دار تو مدت مقررہ کے اختتام تک ادائیگی کرتے رہتے ہیں اور کمپنی اس سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگا کر کثیر منافع حاصل کرتی ہے اور اس میں سے ان لوگوں کو ادا کرتی ہے جو اختتام مدت تک ادائیگی نہیں کر پائے۔ اُن رقوم سے جو ان کمپنیوں کو ادا کی جاتی ہیں اور نفع آور اغراض میں کھپائی جاتی ہیں، فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی، لیکن ہوتا یہ ہے کہ کمپنی اپنی مرکزیت اور ساکھ قائم رکھنے کے لیے اس کا اعلان نہیں کرتی اور اندر ہی اندر ٹھیک ٹھاک کر کے معین منافع ادا کرتی رہتی ہے جس کی ادائیگی کی برداشت وہ اپنے کاروبار کی مختلف صورتوں اور نوعیتوں کے تحت، خسارہ اور نفع دونوں حالتوں میں کر لیتی ہے۔ مختصر یہ کہ مجھے یقین ہے کہ بیمہ مضاربت ہی ہے اور اس میں کسی فریق کے لیے مخاطرت نہیں ہے۔

استاذ عبدالعزیز علی: میں استاذ محمد البنا کی رائے کی تائید کرتا ہوں۔

استاذ خطاب محمد: میرا خیال ہے کہ زندگی کے بیمہ اور اشیاء تجارت و بحری حمل و نقل کے بیمہ کے درمیان خاص طور سے فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ دینی نقطۂ نظر سے شکوک و شبہات

کی بنا پر، انسان بیمۂ زندگی سے بچنے کی آزادانہ کوشش کر سکتا ہے مگر بیمۂ نقل و حرکت ایسی چیز ہے جس پر اکثر تجار کو بحری نقل و حمل کی صورت میں مجبور ہونا پڑتا ہے کیونکہ مروجہ دستور کے مطابق مرسل الیہ ایسے مال کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جس کا بیمہ مال بھیجنے والے تاجر نے نہ کرایا ہو، غالباً ایسی مجبوری کی صورت میں تاجر حضرات کے لیے شرعی مواخذہ سے بچنے کا معقول عذر موجود ہے۔

استاذ حنفی احمد: بعض حضرات نے بیمہ کمپنی کی کچھ خاص صورتیں پیش کی ہیں تاکہ بیمہ کی اباحت و عدمِ اباحت کا حکم ایک مخصوص دائرہ کے اندر بھی معلوم ہو جائے، میرا خیال یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر بھی درست ہے، اب تک بیمہ کی جتنی صورتیں پیش کی گئیں، ان میں سے کسی میں اس کی "واپسی" کی شرط کا ذکر نہیں کیا گیا، یعنی اگر بیمہ دار، عقد بیمہ کو مدت کے اختتام سے پہلے ہی فسخ کرنا چاہے تو جو رقم اس شخص کو واپس ادا کی جاتی ہے وہ ہمیشہ اس شخص کی ادا کردہ رقم سے کم ہوتی ہے۔ اور اگر فسخ، سال بھر سے پہلے ہی ہو تو اسے کچھ واپس نہیں ملتا، اور اس شخص کی ادا کردہ رقم کے بقایا سے باقی بیمہ دار مستفید ہوتے ہیں، اس صورت حال کے پیشِ نظر میں اسے نہایت اہم سمجھتا ہوں کہ بیمہ کی پالیسیاں مثلاً مصر بیمہ کمپنی کی پالیسیاں سامنے رکھی جائیں۔ بہت مناسب ہوتا اگر ادارہ لواء الاسلام، مصر بیمہ کمپنی کے کسی نمائندہ کو اپنے اجتماع میں دعوتِ شرکت دیتا کیونکہ یہ معاملہ بعض شرائط کی وضاحت و تشریح اور بعض ایسی اشیاء کی تحقیق و تفتیش، جو شرائط میں مصرح موجود نہیں ہے، چاہتا ہے۔ یہ مشورہ محض اس نقطۂ نظر سے ہے کہ موضوعِ بحث کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی جا سکے تاکہ ندوہ کے جواب کو ایک معتبر اور محترم حیثیت حاصل ہو سکے۔

استاذ مصطفیٰ زید: حقیقت یہ ہے کہ اگر دو چیزیں نہ ہوتیں تو بیمہ کو مضاربت قرار دیا جا سکتا تھا، ایک یہ کہ مضاربت بالطبع نفع اور نقصان، دونوں میں اشتراک کی متقاضی ہے اور بیمہ بالطبع نقصان سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا، دوسرے یہ کہ فقہاء کے نزدیک یہ بات مضاربت کی شرائط میں سے ہے کہ نفع از روئے نسبت طے ہو اور غیر معین ہو۔ رہی یہ بات کہ بیمہ میں کسی کے اضرار کا کوئی پہلو نہیں، اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ عقد کبھی تو بیمہ دار کو نقصان پہنچاتا ہے

اور کبھی کمپنی کو، اگرچہ عملاً کمپنی کا نقصان ایک نہایت ہی نادر الوقوع صورت ہے۔ کیونکہ وہ مختلف شرائط کے ذریعے اپنا تحفظ پہلے ہی کر لیتی ہے۔ بیمہ دار کا ضرر اس صورت میں ہوتا ہے کہ اگر وہ اقساط کی ادائیگی منقطع کر دے تو کمپنی اسے یا تو بالکل کچھ واپس نہیں دیتی یا اس کی ادا کردہ رقم سے کم واپس دیتی ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر مجھے ان لوگوں کی رائے سے اتفاق ہے جو بیمہ کو ناجائز بتاتے ہیں۔

استاذ محمد ابو زہرہ: کچھ عرصہ ہوا، ایک مجلس ایک اسلامی جمعیت کے دفتر میں منعقد ہوئی تھی جس میں مجھے یاد ہے کہ استاذ محترم خلاف نے بھی شرکت فرمائی تھی، اس مجلس میں ماہرین اقتصادیات نے بیمہ کمپنیوں کے متعلق کچھ بیان کیا تھا اور بتایا تھا کہ بیمہ کی ابتدا، اٹلی کے تاجران بندوق کے درمیان ہوئی، ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ بعض تاجروں کا مالِ تجارت، سمندر میں ضائع ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ انتہائی تنگ دستی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا حل یہ نکالا گیا کہ اگر کسی شخص کا مالِ تجارت سمندر میں ضائع ہو جائے تو تمام تاجر مل کر اس کی معاونت کے طور پر اسے ہر ماہ یا ہر سال ایک معین رقم ادا کریں، یہ چیز ترقی کر کے جہازوں کے بیمہ تک پہنچی کہ اس کا ہر شخص ایک مقررہ رقم ادا کرے۔ اس کے بعد اس نظام میں مزید ترقی ہوئی اور ملاحوں کی جان کا بھی جو بحری خطرات برداشت کرتے ہیں، بیمہ ہونے لگا، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ بیمہ کی حقیقت تعاونِ محض ہے۔

اگرچہ اس کی اصلیت تعاونِ محض تھی لیکن اس کا انجام بھی ہر اس ادارے کا سا ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا کہ یہودیوں نے اس تعاونی نظام کو بھی جس کی بنیاد تعاون علی البر والتقویٰ تھی، ایک ایسے یہودی نظام میں تبدیل کر دیا جس میں قمار اور ربا، دونوں پائے جاتے ہیں، اس طرح تعاون علی البر والتقویٰ کا نظام تعاون علی الاثم والعدوان کے نظام میں تبدیل ہو گیا۔ بہرحال اس وقت ہم بیمہ کی دوسری صورتوں کو چھوڑ کر صرف بیمۂ زندگی کو لیتے ہیں۔ زندگی کا بیمہ اپنی موجودہ صورت و وضع میں یا تو قمار ہوتا ہے جب کہ مدتِ مقررہ کے اختتام کے قبل ہی بیمہ دار کی موت

کی صورت میں اس کے ورثاء میں سے اس کے کسی نامزدہ کو بیمہ شدہ رقم ملتی ہے ، یا ربا ہوتا ہے اگر کل اقساط کی ادائیگی کے بعد بیمہ دار بیمہ شدہ رقم کو مع مزید منافع کے حاصل کرتا ہے ۔ بہر حال ربا ہو یا قمار ، اس معاملہ میں دو مزید خرابیاں ایسی پائی جاتی ہیں جو مذاہبِ اربعہ کے کسی فقیہ کے نزدیک صحیح اور جائز نہیں ۔ پہلی خرابی یہ کہ اس میں مصلحت غیر کی شرط (اشتراط المصلحۃ الغیر) پائی جاتی ہے ، جسے فقہاء "صفقتان فی صفقۃ واحدۃ" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صفقتان فی صفقۃ واحدۃ کی ممانعت مروی ہے[۵] ۔ ممکن ہے اس خرابی سے یہ توجیہ کرکے کہ یہ حدیث حالتِ زیرِ بحث پر مشتمل نہیں ہے ، تساہل برت لیا جائے ۔ لیکن قطع نظر اس سے دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر بیمہ دار کی وفات ہو جائے تو اس کی رقم ، اس کے شرعی ورثاء کے بجائے اس کے نامزد کردہ شخص کو ملتی ہے اور اس صورت میں اسلامی قانونِ وراثت کی صریح مخالفت لازم آتی ہے کیونکہ علمائے شریعتِ اسلامی کے نزدیک یہ امر طے شدہ ہے کہ کسی آدمی کا تمام مال ، خواہ وہ بالفعل اس کا کمایا ہوا ہو ، خواہ وہ اس مال کے سببِ اکتساب کا مالک ہو ، اگرچہ اس کسب کا ثمرہ اس کی موت کے بعد ہی ظاہر ہوا ہو ترکہ سمجھا جائے گا اور اس میں وراثت جاری ہوگی ۔ اسی وجہ سے فقہاء کا قول ہے کہ مالِ متجدد جس کے ذریعہ وسببِ حصول کا کوئی شخص اپنی زندگی میں مالک تھا ، اگرچہ اس کا اثر اس کی وفات کے بعد ہی کیوں نہ ظاہر ہوا ہو ، ترکہ ہی شمار کیا جائے گا ۔ مثلاً کسی شخص نے شکار کے واسطے جال لگایا لیکن شکار اس شخص کی موت کے بعد جال میں پھنسا تو فقہاء کے نزدیک اس قاعدہ کے بموجب وہ ترکہ قرار دیا جائے گا ، لہٰذا اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ وہ رقم اس شخص کی ملکیت ہوگی جس کو متوفی نامزد کر دے تو شریعت کے قانونِ وراثت کی شرائط کی صریح خلاف ورزی ہوگی ۔

---

[۵] دیکھیے نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ ، کتاب البیوع باب البیع الفاسد ، نیل الاوطار للشوکانی ۵/۱۲۱ ۔ رواہ ابوداؤد واحمد والنسائی والترمذی واخرجہ ایضاً الشافعی ومالک فی بلاغاتہ واورد الحافظ روایۃ ابن مسعود فی التلخیص وفی مجمع الزوائد واخرجہ ایضاً البزار والطبرانی فی الکبیر والاوسط وفی الباب عند الدارقطنی وابن عبد البر (مترجم)

سوال یہ ہے کہ اگر بیمہ کاری کا نظام باوجود ان مفاسد کے بہرحال کچھ فوائد پر مشتمل ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ بیمہ کاری کے ایک صحیح شرعی نظام کو یکجا جمع کیا جا سکے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ وہ یہ کہ بیمہ کاری کے موجودہ نظام کو پھر انہی بنیادوں پر قائم کر دیا جائے جن پر وہ پہلے کبھی قائم تھا۔ اس طرح کہ تعاونی کمپنیوں کی تکوین عمل میں لائی جائے جو اُن سارے امور کو انجام دیں جنھیں موجودہ بیمہ کاری کا نظام انجام دیتا ہے اور جس کی بنیاد یہ ہو کہ جو رقم اس تعاون کو ادا کی جائے وہ حالتِ وفات میں "قسط گذار" کے تمام ورثا میں تقسیم کر دی جائے۔

بیمہ کے عقود جو کمپنیوں اور افراد کے درمیان عمل میں آتے ہیں ان کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ آدمی چندہ گذاری کے ذریعے اس کمپنی کا ممبر ہو جاتا ہے حالانکہ یہ قطعی غلط ہے کیونکہ ان عقود میں ایک فریق کمپنی ہوتی ہے اور دوسرا فریق بیمہ دار ہوتا ہے۔ پھر یہ صورت کیسے ممکن ہے کہ بیمہ گذار کمپنی کا ممبر بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسی کمپنی کے اندر ایک فریق تو وہ خود ہو اور دوسرا فریق کمپنی ہو۔

میری رائے یہ ہے کہ بیمہ کاری اپنی موجودہ صورت میں حرام ہے، اس کے اندر ربا، قمار، قانونِ وراثت سے بغاوت، صفقتان فی صفقۃ، سب ہی موجود ہیں، اگرچہ آخری جز تطبیق کے نقطۂ نظر سے صرف احتمالی ہے یقینی نہیں۔

مجھے بعض محترم بزرگوں کی چند رایوں کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ بیمہ اور مضاربت یکساں ہیں، میں نے ہر چند غور و فکر کیا کہ میں بیمہ اور مضاربت کے درمیان مشابہت معلوم کر سکوں مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شرعی مضاربت کی کئی خصوصیات ہیں۔

۱۔ ایک جانب سے سرمایہ ہو اور دوسری جانب سے محنت، نفع دونوں فریقوں کے درمیان تقسیم ہو اور نقصان سرمایہ کار کے ذمہ ہو، بیمہ کاری میں ایسا نہیں ہے کیونکہ

اس میں راس المال صرف منافع کمانا ہے۔

۲۔ منافع کی تقسیم نسبت کی بنیاد پر طے ہو۔ اگر ہم استاذ محمد عبدہٗ کی اس رائے کو تسلیم کر بھی لیں جو معینہ منافع کو جائز بتاتی ہے تو یہ بات محنت کار کے متعلق تو ایک حد تک معقول سمجھی جا سکتی ہے[1] لیکن سرمایہ کار کے متعلق تو اسے کسی طرح معقول کہا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ بر تقدیر مفروضہ یہ عقد اجارہ ہو گا[2] اور یہ بات کہ سرمایہ دار کو اجیر قرار دیا جائے کسی طرح ممکن ہی نہیں، وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں سرمایہ کار کا حصہ، کسب (کمائی) میں فعلی قرار پائے گا[3]۔ مگر جب کہ واقعتاً وہ کسب کرتا ہی نہیں تو وہ یہ معینہ رقم کس چیز کے معاوضہ میں وصول کرتا ہے؟ اور یہ صورت مضاربت کیسے قرار دی جا سکتی ہے؟ کیا عقل و شرع کے نزدیک یہ بات کسی بھی درجہ میں معقول سمجھی جا سکتی ہے کہ محنت کار کی محنت کو سرے سے کالعدم قرار دے دیا جائے؟

۳۔ مضاربت میں جب تک سرمایہ سے عملاً پیداواری نہ ہو جائے اس کی حیثیت کسب یعنی کمائی کی ہوتی ہی نہیں ہے اور بیمہ کی صورت میں جب بیمہ دار کا انتقال، کل سرمایہ کی ادائیگی سے قبل ہی ہو گیا تو اس رقم کے حلال ہونے کی جو اس کے نامزدہ کو حاصل ہو گی کیا صورت ہے اور ایسے معاملہ کو مضاربت کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے۔

استاذ خلاف کی زبان سے یہ بات نہایت عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے کہ بیمہ کا منافع اس ربا کی قبیل سے ہے جس کو سدِ ذریعہ کے طور پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ صورت زیرِ بحث میں منافع، قرض کی ادائیگی مہلت کے عوض میں ہے اور یہ صاف ربا النسیئہ ہے اور ربا النسیئہ ہی ربا الجاہلیہ ہے۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ قرض کی ادائیگی میں مہلت کے

---

[1] یعنی محنت کار کی حیثیت بجائے مضارب کے اجیر کی ہو اور یہ معینہ منافع اس کی اجرت سمجھی جائے [2] جس میں سرمایہ کار کی حیثیت اجیر کی اور محنت کار کی مستاجر کی قرار پائے گی اور معینہ منافع سرمایہ کار کے اجیر ہونے کی اجرت۔ [3] بوجہ اجیر ہونے کے۔ (مترجم)

عوض، قرض میں اضافہ اور زیادتی ربا ہی کی ایک صورت ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ سے جب اس ربا کے متعلق سوال کیا گیا جس کے انکار سے کفر لازم آتا ہے تو آپ نے جواب دیا "ھو الزیادۃ فی الدین" (اس ربا کی حقیقت، قرض پر اضافہ ہے) اس صورت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ منافع، سدِ ذریعہ کی حرمت کے قبیل سے ہے۔ جب یہ شئے خود ہی حرام لذاتہ ہے تو اس سے بڑا اور کون سا جرم ہو سکتا ہے جس کا ذریعہ بننے کی وجہ سے اس کو حرام قرار دیا گیا ہو۔ اس موضوع بحث کا فیصلہ مجلس کی سابقہ نشست میں ہو چکا ہے اور استاذ خلاف کو یہ زیب نہیں دیتا کہ پچھلی بحث کے ختم ہو جانے کے بعد پھر نئے سرے سے اس کو شروع کر دیں۔

ابن نجیم صاحب الاشباہ والنظائر سے جو آنجناب نے نقل فرمایا تھا کہ انھوں نے بیع الوفا کو سمرقند کے لوگوں کی حاجت کے پیشِ نظر جائز قرار دیا، اس کے جواب کا فقہ کے ہر طالب علم کو معلوم ہونا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ بیع الوفاء کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ آیا وہ ربا پر مشتمل ہے یا نہیں۔ جو لوگ اس کی حرمت کے قائل ہیں، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اس میں قطعی اور صریحی ربا پایا جاتا ہے۔ بلکہ ان کی رائے میں اس میں شبہ ربا ہے جو ربا کے مانند ہی عمل کرتا ہے بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ "دعوا الربا والریبۃ"[1] دوسری طرف جو لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بیع ہے جس میں خیارِ شرط پایا جاتا ہے۔ امام زیلعی نے شرح کنز الدقائق میں یہی فیصلہ کیا ہے۔ فقہاء سمرقند نے اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہوئے ان لوگوں کے قول کو اختیار کیا ہے جو اس سے ربا کی نفی کرتے ہیں۔

آنجناب کی یہ بات کہ حاجتمند کو منافع کی شرط پر قرض لینا جائز ہے موضوع زیر بحث سے غیر متعلق ہے کیونکہ گفتگو سود کھانے والے (آکل الربا) کے بارے میں ہے نہ کہ سود کھلانے والے (موکل الربا) کے بارے میں۔ یہ بات تو شرع اور عقل دونوں کے نزدیک طے شدہ ہے کہ اگر

---

[1] مسند احمد، مسند عمر حدیث ۲۴۶ ۱/۲۴، ابن ماجہ ۲/۲۱ و نقلہ ابن کثیر فی تفسیرہ ۲/۵۰ و نسبہ السیوطی ایضاً فی الدر المنثور، ۱/۳۶۵ لابن المنذر (مترجم)

قرض کے حاجت مند کو قرض لینے کی انتہائی شدید ضرورت ہے اور وہ منافع کے بغیر قرض حاصل نہیں کر سکتا تو اس کے لیے قرض لینا حالتِ اضطرار میں مردار کھانے کی طرح جائز ہے۔

کیا بیمہ کرانے والے لوگ بھی اسی طرح کے اضطرار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے دین اور فتاویٰ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور ہم کو عوام الناس کے سامنے ایک ایسی بات رکھنا زیبا نہیں جس میں حرام کو حلال کرنے کی صورت پیدا ہو جائے اور اللہ کی یہ بات ہمارے اوپر صادق نہ ہو جائے "ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھٰذا حلال وھٰذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون"۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا کہ یہ معاملہ امورِ دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "انتم اعلم بامور دنیاکم" (تم اپنے دنیاوی امور کو زیادہ بہتر طور پر جانتے ہو)۔ اس سلسلہ میں اس حدیث سے سند پکڑنا ایسے ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو یہ چاہتے ہوں کہ دین کے احکام کو صرف عبادات کے مخصوص دائرہ تک محدود رکھ کر باقی جتنے فقہی احکام ہیں ان کو حلال و جائز قرار دیدیا جائے۔ اس حدیث کی حقیقی نوعیت کی وضاحت کے لیے عرض ہے کہ یہ حدیث ان لوگوں کے بارے میں وارد ہوئی ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تابیر نخل (کھجور کا پیوند لگانے) کے بارے میں سوال کیا تھا۔ آپ نے ان کو اس فعل سے روکا جس کے نتیجے میں اس سال پھل نہیں آئے۔ جب حضورؐ کو صورتِ حال سے مطلع کیا گیا تو آپ نے فرمایا "انتم ادری بشئون دنیاکم (تم اپنے دنیاوی حالات سے زیادہ واقف ہو)۔ لہٰذا اس حدیث کا انطباق عام تشریعی امور کو چھوڑ کر، صناعت، زراعت اور تجارت کے (تجربی) امور پر کیا جائے گا۔ اس حدیث کے پیچھے پڑے رہنے والوں کے لیے مفید ہوگا کہ اس کے ساتھ ان احادیث کا شمار اور مطالعہ بھی کریں جو معاملات اور اسٹیٹ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور جن پر اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جب کہ اس حدیث کو زراعت، صناعت یا ایسے ہی دوسرے عام اور روزمرہ کے تجربی امور تک محدود رکھا جائے۔

مفتی فلسطین الحاج امین الحسینی :- موضوع زیر بحث بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ چند روز ہوئے ہندوستان کے ایک عالم نے بھی اس موضوع کے سلسلے میں مجھ سے رجوع کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ وسیع مطالعہ کا طالب تھا جس میں ہمارے پیش نظر بیمہ کی پالیسیاں اور شرائط بھی ہوتیں تاکہ اس پر کافی و وافی بحث ہو سکتی۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے ہم میں سے بعض حضرات نے اس کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے چنانچہ اپنی بحث میں ان صاحبان نے کافی گہرائی کا اظہار کیا لیکن اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ اس موضوع پر بحث و مطالعہ اور گہرائی کے ساتھ ہونا چاہیے۔

استاذ ابو زہرہ کی تقریر سے قبل میں نے نوٹ کیا تھا کہ یہود اور اُن کے اس نظام کے آلٹ دینے کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ فلسطین میں قدس کے مقام پر ایک مقدمہ ایک عدالت کے سامنے پیش ہوا تھا جس کا صدر اعلیٰ ایک انگریز تھا۔ یہ مقدمہ بیمہ ہی سے متعلق تھا اور اس پر کافی بحث مباحثہ ہوا۔ معاملہ ایک یہودی کا تھا جس نے ایک گودام کو آگ لگا کر بیمہ کمپنی سے زرِ بیمہ کا مطالبہ کیا تھا۔ تفتیش کے بعد بہت سی دھوکے بازیوں کا انکشاف ہوا جس میں ایک یہ بھی تھی کہ یہودی نے ایک ماہر اندازہ کار (اکسپرٹ) کو رشوت دی تھی جس کی وجہ سے اس نے تلف شدہ مالیت کا اندازہ ایک لاکھ پونڈ پیش کیا تھا حالانکہ اصل مالیت دس ہزار سے کسی طرح زیادہ نہ تھی۔ دوسری دھوکہ بازی یہ تھی کہ اس یہودی نے گودام کا بیمہ کرانے کے چند ماہ بعد خود اس میں آگ لگا دی تھی۔ جج نے فیصلہ دیتے وقت کہا "مجھے بیمہ کے ہر اس مقدمہ پر شبہ ہوتا ہے جس میں آتشزدگی اور یہودی دونوں ہوں" اور دعویٰ خارج کر کے یہودی کو حراست میں لے لیا۔ یہودی اخبارات میں اس کے متعلق بہت شور مچا اور جج پر بہت الزامات لگائے گئے۔

جو بحث اس وقت ہوئی، اس سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ بیمہ کے معاملہ میں تھوڑا بہت نہیں بلکہ پورا پورا شبہ موجود ہے اور حضور کا یہ فرمان "دع ما یریبک الیٰ ما لا یریبک"

ہمارے لیے یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ ہم احوط کو اختیار کریں اور شکوک و شبہات سے پرہیز کریں۔ مسلمانوں نے اس قسم کے بہت سے معاملات میں ان کی خوبیوں کے متعلق حسنِ ظن کے ساتھ حصہ لیا لیکن ان میں پوری طرح مبتلا ہو جانے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ وہ محض سراب تھا۔ ان کمپنیوں کا غیر ملکی ہونا ہی ایک اچھے خاصے شبہ کی بات ہے۔ پھر ان غیر ملکی کمپنیوں کی موجودگی ہماری سرزمین پر موجودہ شبہ میں ڈالنے والی بات ہے۔ اور ہم سے احتیاط اور کافی غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان کمپنیوں کی تاسیس کا کیا مقصد ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اپنے مصالح و فوائد کے پیشِ نظر قائم کی گئی ہیں نہ کہ ہمارے مصالح و فوائد کے لیے۔ مزید براں یہ کہ ان کمپنیوں کے نظامِ کار میں قمار، ربا، اضرار سبھی کچھ ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر میں احتیاط کا موقف اختیار کرنے کے بارے میں استاذ الینا کی تائید کرتا ہوں اور اخیر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسا استاذ ابو زہرہ نے فرمایا، میں اس سے قطعی متفق ہوں کہ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم یہ کوشش کریں کہ ایسی تعاونی کمپنیاں وجود میں آئیں جو ہمارے مخصوص مصالح اور مفادات کے ساتھ مناسبت رکھتی ہوں اور ماہرینِ شریعت اور ماہرینِ اقتصادیات پر مشتمل ہوں تاکہ وہ اسلامی تعاونی کمپنیوں کے لیے ایسا نظامِ کار وجود میں لا سکیں جو اسلامی روح کے موافق ہو اور اس بیمہ کے موجودہ نظام میں جو فوائد پائے جاتے ہیں، ان کا مطالعہ کر کے ان کو ہماری اقتصادیات اور شریعت کی باہمی ہم آہنگی کے اصول پر اس نظام میں رکھا جا سکے۔

استاذ ابو زہرہ: میں اپنی طبیعت میں بیمہ کے خلاف شدید تنفر کا احساس پاتا ہوں کیونکہ مجھے اس میں تحکم فی القدر کی بُو آتی ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ یہ آئندہ زمانہ کے لیے ایک احتیاطی تدبیر ہے اور مستقبل کے لیے احتیاطی تدبیر کے متعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "انک ان تدع ورثتک اغنیاء خیر من ان تدعھم عالۃ یتکففون الناس"[1] (تمہارا اپنے ورثاء کو غنی چھوڑنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ان کو ایسا محتاج

[1] متفق علیہ، اخرجہ ایضا احمد والشافعی۔ اصحاب السنن و بیہقی و صححہ الترمذی (مترجم)

چھوڑو کہ وہ لوگوں سے سوال کریں)۔ علاوہ بریں ماہرینِ اقتصادیات کا شریعتِ اسلامیہ کے ماہرین سے اس مقصد سے رجوع کرنا زیبا نہیں کہ وہ بیمہ کو حلال قرار دے دیں یا حلت کے لیے کوئی حیلہ نکال دیں، انھیں بجائے اس کے یہ چاہیے کہ علماء سے رجوع کر کے حلال و حرام کی حدیں معلوم کریں اور اس کے بعد اسے اپنا فریضہ سمجھیں کہ غور و فکر کے بعد بیمہ کاری کا ایسا نظام ایجاد کریں جو شریعت سے مطابقت و موافقت رکھتا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ماہرینِ اقتصادیات کے لیے یہ کام ایسا کچھ دشوار نہیں ہے۔ خرابی دراصل یہ ہے کہ ہمارے ماہرینِ اقتصادیات شریعتِ اسلامیہ سے کہیں بڑھ کر مغربی اقتصادیاتی اصولوں پر ایمان و یقین رکھتے ہیں۔ ان حضرات کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ جیسے ان کے زعم کے مطابق "ربا" سے مفر نہیں ویسے ہی بیمہ سے بھی مفر نہیں۔ ان لوگوں کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ "اے ماہرینِ شریعت تمہارا فریضہ یہ ہے کہ شریعت میں زمانہ کے حالات کے موافق لچک کا سامان فراہم کرو اور اپنی فکر میں وہ لچک پیدا کرو کہ تم اس قابل ہو جاؤ کہ ہم تم سے فتاویٰ حاصل کریں" یا زیادہ صحیح طور سے یہ سمجھیے کہ یہ لوگ بجائے یہ سمجھنے کے کہ شریعت زمانہ کی محکوم نہیں بلکہ اس پر حاکم ہے اور حقیقی انسانی ارتقاء کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کتاب و سنت کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہے، یہ چاہتے ہیں کہ شریعت کو زمانہ کا غلام بنا دیں۔ ماہرینِ اقتصادیات کا فریضہ یہ ہے کہ وہ پہلے خود شریعت کے حکم کے آگے گردن ڈال دیں اور اس کے بعد بیمہ اور بینکنگ کا ایسا نظام تعمیر کریں جو امتِ مسلمہ کے ہمراہ شریعتِ اسلامیہ کے سائے میں پروان چڑھ سکے۔

میں ایسے علماء کا سخت ترین مخالف ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم ان امور کی کھوج کریں جو ان اقتصادیین کی موافقت میں ہوں، جو اپنے علم الاقتصاد اور نظریات پر، شریعتِ اسلامیہ سے کہیں زیادہ ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ اپنی پاکیزہ و اعلیٰ شریعت کی محافظت و کفالت کے لیے کافی ہے۔

وقت کا وقت ہو چکا تھا لہٰذا مجلس کی کارروائی ختم کی گئی اور حاضرین منتشر ہو گئے۔

(بشکریہ برہان دہلی)